پرایا بوجھ
مصنف : گرانٹ فریلنگ
مترجم : سنجیدہ کاظمی
(اقبال کاظمی)
سیف الملوک عباسی
محمد نعمان
عقیل قریشی
صائم بھائی
محمد سجاد بھٹی
جاسوسی ڈائجسٹ : نومبر 1985

مُجرم بڑی ذہانت سے جال بُنتا ہے اور بعض اوقات دُنیا والوں کی نظر میں دھول جھونکنے میں کامیاب بھی ہوجاتا ہے مگر گناہ گاروں کو سزا دینے کا قدرت کا اپنا بھی ایک نظام ہے۔ قدرت سے سزا پانے والے ایک گناہ گار کا قصّہ جس نے اپنے گناہ کا بوجھ کسی اور کے کندھوں پر لاد دیا تھا۔

سنجیدہ کاظمی

رضا حیدر نے طیّارے کی جائے حادثہ سے زیادہ سے زیادہ بیس میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اس کی چھٹی حِس خطرے کی گھنٹی بجانے لگی۔ اسے بڑی شدّت سے یہ احساس ہونے لگا کہ اس کا تعاقب کیا جارہا تھا۔ پہلے تو وہ اپنے اس احساس کو محض واہمہ سمجھا تھا۔ بھلا اس ویرانے میں، جہاں میلوں دور تک کسی ذی روح کا نشان تک نہیں تھا، اس کا تعاقب کون کرسکتا تھا لیکن اسے اپنی چھٹی حِس پر پورا اعتماد تھا جس نے اسے کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔

نوجوان رضا حیدر ایک پرائیویٹ دو انجن والے سیسنا طیّارے کا پائلٹ تھا جو بدقسمتی سے حادثے کا شکار ہوگیا تھا اور وہ اپنے طیارے کے زخمی مسافروں کے لیے امداد لینے جارہا تھا۔ وہ سانس لینے کے لیے ایک چٹان کے دامن میں رُک گیا۔ اس کے چاروں طرف چشمۂ قل کا سلسلۂ کوہ پھیلا ہوا تھا۔ دُھند آلود فضا میں پہاڑی چوٹیاں نگاہوں سے اوجھل ہوچکی تھیں۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے پہاڑوں کی یہ چوٹیاں دُھند کو چیرتی ہوئی آسمان تک پہنچ رہی ہوں۔ ایک بڑے سے پتھر

پر بیٹھے بیٹھے اس نے پیچھے مڑ کر اس راستے کی طرف دیکھا جسے طے کرتا ہوا وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اور اسی لمحے اسے ایک آدمی کا ہیولا سا دکھائی دیا — جو بڑی پھرتی سے پتھروں کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس آدمی کی ایک جھلک سے تصدیق ہو گئی تھی کہ اس کا واقعی تعاقب کیا جا رہا ہے۔

رضا اگرچہ بزدل نہیں تھا لیکن اس ویرانے میں کسی کو اپنے تعاقب میں پا کر اسے ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس کا تعاقب کرنے والا اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس کے طیارے کے مسافروں میں ایک ایسا آدمی بھی تھا جو ایک بہت بڑے جرم کا مرتکب ہو چکا تھا۔ انسانی زندگی اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ پہلی مرتبہ جب رضا کے ذہن میں تعاقب کا شبہ ابھرا تھا تو اس وقت بھی اس کی نظروں کے سامنے اسی شخص کا چہرہ گھوم گیا تھا کیونکہ طیارے کے مسافروں میں خود اس کے علاوہ وہی ایک ایسا شخص تھا جسے زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں لیکن رضا جب وہاں سے روانہ ہوا تھا تو اس وقت وہ شخص قیدی کی حیثیت سے ایک اور مسافر کے پستول کی زد پر تھا اور اب رضا یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے تو یقیناً اس نے دوسرے مسافر سے پستول بھی چھین لیا ہوگا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو یہ بھی کچھ بعید نہیں تھا کہ فرار ہوتے ہوئے اس نے طیارے کے دوسرے زخمی مسافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ ایسی صورت میں رضا ہی وہ واحد شخص زندہ بچا تھا جو اس بات کی گواہی دے سکتا تھا کہ شیراز آئل کمپنی کے ملازمین کی تنخواہوں کی رقم کس نے چرائی تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ وہ خطرناک شخص اب رضا کو بھی ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے گا تاکہ اس کے جرم پر ہمیشہ کے لیے پردہ پڑا رہے۔

رضا کے خیال میں بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ شخص اس علاقے کو اس سے زیادہ جانتا تھا۔ اسے تو کوئی ایسا طریقہ سوچنا تھا جس سے اس شخص پر قابو پایا جا سکے لیکن اس کا ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

بتیس سالہ رضا حیدر، ایرانی فضائیہ کا فائٹر پائلٹ تھا لیکن کچھ عرصہ قبل میڈیکلی اَن فٹ ہونے کی بنیاد پر اسے فضائیہ کی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا تھا۔ چند ماہ بیکاری میں گزارنے کے بعد اسے شیراز آئل کمپنی میں سیسنا طیارے کے پائلٹ کی حیثیت سے ملازمت مل گئی اور وہ گزشتہ تین برسوں سے بڑی خوش اسلوبی سے یہ ں انجام دے رہا تھا۔ شیراز آئل کمپنی کا ہیڈ کوارٹر اگرچہ تہران میں تھا لیکن تیل اور قدرتی گیس کی تلاش میں یہ کمپنی ملک کے مختلف حصوں میں کھدائی کا کام کر رہی تھی۔ بعض کنوؤں سے تیل برآمد ہونے کے بعد وہاں مستقل کام جاری تھا۔ رضا حیدر کا اصل کام ملک کے دور دراز علاقوں میں، جہاں جہاں کمپنی کا کام ہو رہا تھا، راشن اور ضرورت کی دوسری چیزیں پہنچانا تھا۔ کبھی کبھار اسے کمپنی کے مالک اسفندیار کو بھی اپنے طیارے کے ذریعے مختلف جگہوں پر لے جانا پڑتا تھا۔

ملک کے جنوب میں خلیج فارس کے ساحل سے تقریباً سو میل اندر لارستان کے پہاڑی علاقے میں بیرام نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب بھی کمپنی کا ایک کیمپ قائم تھا جہاں کچھ عرصہ قبل کھدائی کا کام شروع کیا گیا تھا۔ کمپنی اس منصوبے پر بے حساب رقم خرچ کر چکی تھی لیکن ابھی تک تیل کی برآمد کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ اسفندیار کا خیال تھا کہ یہاں کام بند کر دیا جائے لیکن اس کے جیالوجسٹ کا اصرار تھا کہ کھدائی کا کام جاری رکھا جائے کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہاں سے تیل ضرور برآمد ہوگا۔ یہ علاقہ سطح مرتفع پر مشتمل تھا اور یہاں زیادہ گہرائی تک کھدائی کی ضرورت تھی۔ اسفندیار نے بڑی حیل و حجت کے بعد کام جاری رکھنے کی اجازت دی تھی۔

دو دن قبل اسفندیار، اہواز کے قریب ایک کیمپ کا دورہ کر کے لوٹا تھا لیکن تہران پہنچتے ہی اسے بیرام کیمپ کے نورمین کمال کی طرف سے اطلاع ملی کہ کمپنی کے ملازمین نے اپنے مطالبات کے حق میں ہڑتال کی دھمکی دے دی ہے۔ اسفندیار جانتا تھا کہ اس کیمپ کے تقریباً دو ہزار ملازمین تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ کر رہے تھے اور وہ اس مطالبے کو اب تک ٹالتا آیا تھا۔ اس کیمپ میں بیک وقت تین کنوؤں کی کھدائی ہو رہی تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر ایک مرتبہ ملازمین نے ہڑتال کر دی تو نہ صرف اس کا یہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ جائے گا بلکہ اسے لاکھوں کا نقصان بھی اٹھانا پڑے گا۔ اس لیے اسفندیار نے خود بیرام کیمپ جانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ ملازمین کو سمجھا سکے۔

اسفندیار ایک جہاں دیدہ آدمی تھا۔ وہ کارکنوں کی نفسیات سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ اسے یقین تھا کہ کیمپ کے ملازمین اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر وقتی طور پر تنخواہوں میں اضافے کے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اگلے دن کیمپ کے ملازمین کو تنخواہیں بھی دی جانے والی تھیں۔ اس نے اسی روز بینک سے مطلوبہ رقم نکلوائی اور بیرام کیمپ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسفندیار کی خوبصورت بیوی فرشتی بھی اس کے ساتھ جانے کو تیار تھی بلکہ اسے ساتھ لے جانے کا پروگرام اسفندیار ہی نے بنایا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس مرتبہ کیمپ کے ملازمین کی تنخواہیں خوبصورت فرشتی کے ذریعے تقسیم کرائے گا کیونکہ اس طرح ملازمین

اپنے مطالبے کو بھول جائیں گے۔ اسفندیار یہ حربہ کئی کیمپوں میں آزما چکا تھا۔ خوبصورت فرشتی مزدوروں میں گھل مل جاتی اور یہ بے چارے مزدور اپنے مطالبات تو کیا اپنے آپ کو بھی بھول جاتے۔

رضا انہیں بیرام کیمپ چھوڑ کر تہران واپس آ گیا تھا لیکن دو دن بعد ہی اسے اسفندیار کا پیغام ملا کہ وہ فوراً بیرام کیمپ پہنچ جائے۔ رضا اس روز معمول کی سپلائی لے کر مازندران کے کیمپ کی طرف جانے والا تھا لیکن ظاہر ہے وہ کمپنی کے مالک کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے طیارے پر لدا ہوا سامان اُتروا دیا اور بیرام کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ بیرام کیمپ میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔ بیرام کیمپ کی عارضی ہوائی پٹی پر لینڈ کرتے ہوئے بھی اس کا ذہن انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا۔

طیارہ رن وے پر دوڑتا ہوا جب ٹرمینل ہٹ کے قریب پہنچا تو اسے اسفندیار نظر آ گیا جو ہٹ سے باہر آ رہا تھا۔ رضا طیارے سے اُتر کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچتے ہی اسے چونک جانا پڑا۔ اسفندیار کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اس کے قریب ہی کیمپ کا قوی الجثہ فورمین کمال بھی موجود تھا۔

"بڑی گڑبڑ ہو گئی رضا!" اسفندیار اس کے قریب آتے ہی بولا۔ "کیا ہم فوری طور پر شیراز کے لیے پرواز کر سکتے ہیں؟"

"صرف ایندھن بھرنے میں وقت لگے گا۔ اس کے علاوہ میری طرف سے کوئی تاخیر نہیں ہو گی لیکن معاملہ کیا ہے؟" رضا نے کہتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ناصر کو لے جانا ہے۔" اسفندیار کے بجائے کمال نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ "میں ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں کہ یہ لوگ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ انہیں ضرورت سے زیادہ ڈھیل نہیں دینی چاہیے لیکن میری بات پر کبھی کان نہیں دھرا گیا اور آج اس کا نتیجہ سامنے ہے۔"

"لیکن ہوا کیا؟" رضا نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا، وہ کم بخت تنخواہوں کی رقم لے اُڑا۔" فورمین کمال نے بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

رضا سناٹے میں آ گیا۔ اس واقعے کی تفصیل اسے کچھ دیر بعد اسفندیار سے معلوم ہوئی تھی۔ وہ لوگ اس وقت اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جو کیمپ کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسفندیار کے بیان کے مطابق دو روز پہلے وہ کیمپ کے ملازمین کی تنخواہوں کی رقم، پانچ لاکھ ریال، تہران سے ساتھ لے کر آیا تھا۔ پہلے دن یہ رقم اس کے سوٹ کیس میں رہی تھی لیکن کل شام سے کچھ پہلے اس نے رقم دفتر کے سیف میں منتقل کر دی۔ کل کا دن اس نے اور فرشتی نے مزدوروں سے مذاکرات میں گزارا تھا۔ ان دونوں نے ایسے نفسیاتی حربے استعمال کیے تھے کہ کیمپ کے ملازمین اپنی تنخواہوں میں اضافے کے مطالبے سے وقتی طور پر دستبردار ہو گئے تھے۔ گویا اسفندیار ایک بار پھر انہیں وعدۂ فردا پر ٹالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ معاملہ طے ہونے کے بعد آج وہ کیمپ کے ملازمین کو تنخواہیں دینے والا تھا لیکن صبح اس نے جیسے ہی دفتر کا سیف کھولا، رقم غائب تھی۔ اسفندیار نے فوراً ہی کمال کو اپنے دفتر میں طلب کر کے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے ہدایت کی کہ فیروز آباد پولیس کو ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے اِس واردات کی اطلاع دے دی جائے۔

"اس صورتِ حال سے میں خود بھی نمٹ سکتا ہوں۔" کمال نے جواب دیا۔ "فیروز آباد یہاں سے تقریباً سو میل دُور ہے اور پولیس کو یہاں پہنچنے میں کئی گھنٹے لگ جائیں گے جبکہ اس دوران مجرموں کو فرار ہونے کا موقع مل جائے گا۔ میں کیمپ کے تمام آدمیوں کو جانتا ہوں کہ کون کس کردار کا مالک ہے۔ اگر میں چور کو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو پھر یقیناً پولیس کو اطلاع دیدی جائے گی۔"

کمال کا یہ استدلال درست تھا کہ پولیس کے آنے تک مجرم یا مجرموں کو فرار ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔ لہٰذا اسفندیار نے اسے اپنے طور پر تفتیش کی اجازت دے دی۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد کمال مسکراتا ہوا دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کینوس کا بیگ تھا جس میں کرنسی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

"ناصر۔" وہ بیگ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے پہلے ہی اس پر شبہ تھا۔ یہ رقم اس کے سوٹ کیس سے برآمد ہوئی ہے۔ اس نے مزاحمت کرتے ہوئے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں وہ میرے ہاتھوں پٹنے کے بعد بے ہوش پڑا ہے۔"

بیگ سے برآمد ہونے والی رقم صرف دس ہزار ریال تھی۔ اسفندیار اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے شبہ ہے کہ اس میں کچھ دوسرے لوگ بھی ملوث ہیں۔" کمال بولا۔ "وہ یقیناً باہر کے لوگ ہیں اور ناصر نے رقم کے بارے میں مخبری کی ہو گی۔ ناصر کے قبضے سے برآمد ہونے والی دس ہزار ریال کی اس رقم کو ہم اس کا حصہ سمجھ سکتے ہیں۔"

"ناصر کہاں ہے؟" اسفندیار نے پوچھا۔

"ڈسپنسری میں۔" کمال نے مختصر سا جواب دیا۔

اسفندیار دفتر کے ہٹ سے نکل کر اس خیمے میں پہنچ گیا جسے کیمپ کی ڈسپنسری کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ ناصر اسپرنگوں والی چارپائی پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے ایک بازو پر کلائی سے کندھے تک پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ ناصر کی عمر زیادہ سے زیادہ

تیس برس رہی ہوگی۔ وہ بیرام نامی اس بستی کا رہنے والا تھا جو کیمپ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ اسے کمپنی میں ملازمت اختیار کیے صرف چھ سات مہینے ہوئے تھے اور وہ مزدوروں کی ایک پارٹی کا انچارج تھا۔

"یہ کب تک ہوش میں آئے گا؟" اسفندیار نے سوالیہ نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"اس کا فوری طور پر ہوش میں آنا مشکل ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے جس پر میں نے پٹی باندھ دی ہے۔ جسم پر کچھ اور چوٹیں بھی ہیں لیکن ایکسرے کے بغیر یہ بتانا مشکل ہے کہ ہڈیوں کو بھی ضرب پہنچی ہے یا نہیں۔ تم نے اسے کس چیز سے مارا تھا کمال؟" ڈاکٹر نے آخری الفاظ کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔

"رینچ سے۔" کمال نے جواب دیا۔ "اس وقت وہی میرے ہاتھ میں آگیا تھا جسے مجبوراً مجھے اپنے دفاع کے لیے استعمال کرنا پڑا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ مجھے قتل کر دیتا کیونکہ میں نے جیسے ہی اس کے سامان کی تلاشی لینا چاہی تھی، اس نے چاقو نکال کر مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔"

"بہتر ہوگا کہ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا جائے۔ بصورتِ دیگر یہاں میں اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔" ڈاکٹر نے اسفندیار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اور اس کے بعد ہی اسفندیار نے اپنے تہران ہیڈکوارٹر سے رابطہ قائم کر کے رضا کو طیارہ لے کر جلد سے جلد یہاں پہنچنے کا حکم دیا تھا۔

"اور ناصر ابھی تک ہوش میں نہیں آیا ہے؟" رضا نے پوری بات سننے کے بعد حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" اسفندیار نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے شیراز کے اسپتال پہنچانا ہوگا۔ قریب ترین شہر وہی ہے لیکن شمال مشرق کا یہ علاقہ کل سے بری طرح دھند کی لپیٹ میں ہے۔"

رضا کمرے سے باہر نکل آیا۔ اپنی نگرانی میں طیارے میں ایندھن بھرواتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی الجھن تیر رہی تھی۔ وہ کئی مرتبہ بیرام کیمپ آچکا تھا۔ اگرچہ کیمپ کے انچارج کمال سے ہر مرتبہ اس کی ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن اس نے کمال کو کبھی بھی پسند نہیں کیا تھا۔ وہ انتہائی خودغرض اور کینہ پرور آدمی تھا۔ کیمپ کے اکثر ملازمین اس کے رویے سے نالاں تھے۔ ناصر کے ساتھ تو اس کا سلوک بہت ہی معاندانہ تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے کام میں مین میخ نکالتا رہتا اور وقتاً فوقتاً اسے ملازمت سے برطرفی کی دھمکیاں بھی دیتا رہتا لیکن ناصر نے غالباً کبھی اس کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

رضا کو اس سے بحث نہیں تھی کہ ناصر چور تھا یا نہیں لیکن اس وقت اسے اسپتال پہنچانا بہت ضروری تھا۔ کمپنی کا مالک اسفندیار بھی اگرچہ بے ہوش ناصر سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا لیکن رضا اچھی طرح جانتا تھا کہ اس ہمدردی کے پس منظر میں پانچ لاکھ ریال کی وہ رقم پوشیدہ تھی جس کے بارے میں وہ ناصر سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔

لینڈنگ کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد سیسنا دوبارہ پرواز کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ناصر کو اسٹریچر پر ڈال کر طیارے پر لاد دیا گیا۔ اسٹریچر کو چرمی پٹیوں سے اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ طیارے کے ٹیک آف یا لینڈنگ کے وقت وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے۔ اسفندیار اور فرشتی کا سامان بھی طیارے میں لادا جا چکا تھا اور روانگی سے صرف چند منٹ پہلے رضا یہ جان کر حیران رہ گیا کہ کمال نے بھی ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری ضرورت تو نہیں۔" اسفندیار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ضرورت ہے۔" کمال بولا۔ "اسپتال میں پولیس والے اس کے زخمی اور بے ہوش ہونے کی وجہ جاننا چاہیں گے۔ اس لیے میرا ساتھ جانا بہت ضروری ہے۔" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر کمال نے اپنا کینوس کا بڑا سا بیگ طیارے کے کارگو کمپارٹمنٹ میں ایک کھونٹی پر ٹانگ دیا۔

رضا نے طیارے کا انجن اسٹارٹ کر دیا اور ٹیک آف سے پہلے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر قریب ترین کنٹرول ٹاور سے موسم کی رپورٹ مانگی تو اسے بتایا گیا کہ خلیج فارس کی طرف سے ہوا کا طوفان اٹھ رہا ہے جس کا رخ ساحلی علاقے لارستان کی طرف ہے۔ اس کے ساتھ ہی دھند میں اضافہ ہونے کی پیشگوئی بھی کی گئی تھی۔

"ہمیں بھی لارستان میں چشمہ اقل کے سلسلہ کوہ کو عبور کر کے جانا ہوگا۔ خراب موسم کی وجہ سے کوئی گڑبڑ تو نہ ہوگی؟" اسفندیار نے پوچھا۔

"نہیں، میرا خیال ہے کہ ہم طوفان کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے وہ علاقہ عبور کر چکے ہوں گے۔" رضا نے بتایا۔ "لیکن اس بات کا خیال رہے کہ ان علاقے کے موسم کا کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔"

ٹیک آف کے تقریباً دس منٹ بعد پہاڑی علاقے پر پرواز کرتے ہوئے طیارے کو مخالف ہوا کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی دھند میں اضافہ ہونے لگا۔ رضا اگرچہ

بیسوں مرتبہ اس طرف آچکا تھا لیکن اس علاقے کا موسم کبھی بھی اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ تیز ہوا کے باوجود یہاں دبیز دھند پھیل جاتی تھی جو بعض اوقات کئی ہفتوں تک برقرار رہتی۔ ہوا کے دباؤ میں آکر ہلکا سا سیسنا کئی مرتبہ لہراتا ہوا سیکڑوں فٹ نیچے تک چلا گیا تھا اور ہر مرتبہ رضا کو اسے سنبھالنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایسے موقع پر وہ طیارے کو سنبھالنے کے بعد پیچھے مڑ کر ضرور دیکھتا۔ اس کے مسافروں کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ خوف کی فضا نے ان سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

دفعتاً یوں محسوس ہوا کہ جیسے اسٹار بورڈ سائیڈ سے طیارے پر زوردار ضرب لگائی گئی ہو۔ ہوا کے زوردار تھپیڑے سے بے قابو ہو کر طیارہ منہ کے بل تیزی سے نیچے جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی فرشتی کی ایک تیز چیخ طیارے کی فضا میں گونجی۔ رضا اپنی تمام تر مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے طیارے کو قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کئی گھنٹوں سے یہ جدوجہد کر رہا ہو لیکن درحقیقت یہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی۔ وہ طیارے کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی لمحے طیارے کے سامنے کی دھند اس طرح چھٹ گئی جیسے اچانک ہی بادل چھٹ گئے ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی رضا کا دل بھی اچھل کر حلق میں آگیا۔ آگے صرف چند سو فٹ کے فاصلے پر پہاڑی چوٹی راستہ روکے کھڑی تھی اور طیارہ بڑی تیزی سے چوٹی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

صورتِ حال انتہائی خوفناک تھی لیکن اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے رضا نے طیارے کو ایکدم اوپر اٹھا دیا۔ چوٹی سے صرف دس فٹ کے فاصلے پر سیسنا اوپر اٹھتا چلا گیا مگر اس کا پچھلا حصہ چوٹی سے ٹکرا گیا۔ اس ٹکر سے طیارہ ایک بار پھر بے قابو ہو کر بڑی تیزی سے نیچے جانے لگا۔ انتہائی کوشش کے باوجود رضا اس مرتبہ طیارے کو نہیں سنبھال سکا۔ اس پہاڑی کے دوسری طرف پتھریلا میدان تھا اور طیارہ منہ کے بل نیچے جا رہا تھا۔ آخری لمحوں میں رضا اپنی کوشش میں صرف اس حد تک کامیاب ہو سکا تھا کہ اس نے طیارے کو منہ کے بل گرنے سے بچا لیا اور طیارہ پیٹ کے بل پتھروں پر لڑھکتا ہوا بالآخر ایک جگہ رک گیا۔

طیارے کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے لیکن رضا کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ نہ صرف وہ بلکہ اس کے دوسرے ساتھی بھی معجزانہ طور پر موت کا نوالہ بننے سے بچ گئے تھے۔ وہ چند لمحے اپنی سیٹ پر بیٹھا گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر سیفٹی بیلٹ کھول کر سیٹ سے اٹھ گیا۔ اسے طیارے کے پچھلے حصے تک آنے میں دو سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

اسفندیار کے چہرے پر دہشت نمایاں تھی، وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے ایک ہاتھ سے دوسرا بازو دبائے بیٹھا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ رضا نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا کہ چوٹ اگرچہ زیادہ گہری نہیں تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے کندھے کا جوڑ اکھڑ چکا تھا جس کی وجہ سے اسفندیار زیادہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ دوسری سیٹ پر فرشتی بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اسے بظاہر کوئی چوٹ نہیں آئی تھی لیکن صدمے کے باعث بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس سے پیچھے والی سیٹ پر کمال تھا" جس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ طیارے کو جھٹکا لگنے سے اس کا منہ اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرایا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اور کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ اسٹریچر پر بندھا ہوا ناصر بدستور بے ہوش تھا۔ بظاہر اسے بھی کوئی نئی چوٹ نہیں آئی تھی لیکن اس کا پہلے سے زخمی بازو اور جسم کی دوسری چوٹیں اسے بدستور بے ہوش رکھنے کے لیے کافی تھیں۔ رضا نے اسٹریچر کے اسٹریپ کھول دیے اور ناصر کو کندھے پر اٹھا کر طیارے سے باہر لے آیا۔ کچھ دیر بعد وہ کمال کی مدد سے فرشتی اور اسفندیار کو بھی طیارے سے باہر لانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

طیارے سے تقریباً سو فٹ دور رضا، ناصر اور فرشتی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کمال کی آواز سن کر چونک گیا۔

" انہیں یہیں چھوڑ دو۔ یہ خود ہی ہوش میں آجائیں گے۔ ہمیں سب سے پہلے سامان طیارے سے نکالنا چاہیے۔"

" سامان!" رضا نے اسے گھورا۔ " اگر ہمت کر سکو تو خود ہی سامان نکال لو۔ طیارے کا فیول ٹینک کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔"

رضا ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کا جائزہ لینے لگا۔ خلافِ توقع انہیں بہت کم نقصان پہنچا تھا۔ اسفندیار کا بازو کندھے سے اکھڑنے کے علاوہ کہنی کے اوپر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ فرشتی کے صرف پاؤں میں جھٹکا آیا تھا جس سے وہ ٹخنے میں کچھ تکلیف محسوس کر رہی تھی، کمال کی صرف ناک پر چوٹ لگی تھی اور ناصر کو کوئی نئی چوٹ نہیں آئی تھی البتہ وہ بدستور بے ہوش تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد رضا کو یقین ہو گیا کہ اب طیارے میں آگ لگنے کا خطرہ نہیں رہا تو وہ کاک پٹ میں پہنچ گیا تاکہ ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے پیغام دے کر مدد طلب کر سکے لیکن یہ جان کر اسے سخت مایوسی ہوئی کہ ریڈیو ٹرانسمیٹر ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اس دوران اسفندیار، فرشتی اور کمال دوبارہ طیارے کے قریب آچکے تھے۔ کمال نے بے ہوش ناصر کو کندھے پر لاد رکھا تھا پھر اس نے ناصر کو اس طرح زمین

پر پٹخ دیا جیسے وہ کوئی بے جان چیز رہی ہو۔

"سارا قصور اسی کا ہے۔" وہ چیختے ہوئے بولا۔ "اسی کی وجہ سے ہم اس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہیں۔"

رضا کوئی تبصرہ کیے بغیر طیارے کے کارگو کمپارٹمنٹ میں گھس گیا اور لکڑی کی ٹوٹی ہوئی ایک پیٹی کی پٹیاں اکھاڑ کر اسفند یار کے بازو پر باندھنے لگا تاکہ ٹوٹی ہوئی ہڈی اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے پھر فرشتی کے ٹخنے پر ایک لوشن کی مالش کرنے لگا جس سے حیرت انگیز طور پر اس کی تکلیف کم ہو گئی۔ اس کے میڈیکل بکس میں صرف ایسی ادویات موجود تھیں جن سے فرسٹ ایڈ کے طور پر کام لیا جا سکتا تھا اور وہ ان چیزوں سے بھرپور استفادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اگرچہ دوپہر کا وقت تھا لیکن فضا میں پھیلی ہوئی دبیز دھند کے باعث یوں لگ رہا تھا جیسے شام ہو رہی ہو۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ مقررہ وقت پر شیراز ائیرپورٹ پر نہیں پہنچے گا تو امدادی طیارے اس کی تلاش شروع کر دیں گے لیکن دھند کے باعث اوپر سے انہیں دیکھ لیا جانا ممکن نہیں تھا۔ دھند کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کئی روز تک اسی طرح برقرار رہے گی۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ انہیں جو کچھ بھی کرنا تھا اپنے طور پر ہی کرنا تھا۔

"مجھے یا کمال کو امداد حاصل کرنے کے لیے جانا پڑے گا۔" رضا نے اپنے سامنے نقشہ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم شمال مشرق کا رخ کریں تو تقریباً پچھتر میل کے فاصلے پر واقع فیروز آباد پہنچ سکتے ہیں۔ فیروز آباد کے نواح میں دور تک چراگاہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ممکن ہے راستے ہی میں ہمیں کوئی چھوٹی سی آبادی مل جائے۔ ہم یہاں بیٹھ کر کسی امدادی پارٹی کے پہنچنے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ اگر طیاروں کے ذریعے ہماری تلاش شروع ہو بھی گئی تو دھند کے باعث اوپر سے وہ لوگ ہمیں نہیں دیکھ سکیں گے اور پھر ان دنوں رات کے وقت یہ علاقہ شدید سردی کی لپیٹ میں آ جاتا ہے جو ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہو گی۔"

"میں جاؤں گا۔" کمال نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "میں اس علاقے سے کسی حد تک واقف ہوں۔ مجھے فیروز آباد پہنچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے جانا چاہیے۔" رضا نے کہا۔ "اس کے ساتھ ہی ہمیں یہاں آگ روشن کر لینی چاہیے۔ جتنا بڑا الاؤ ہو گا اتنا ہی ہمارے لیے مفید ہو گا۔ ممکن ہے ہمیں تلاش کرنے والے طیارے آگ کو دیکھ کر صورتِ حال کو سمجھ سکیں۔"

"آگ کس چیز سے جلاؤ گے۔" فرشتی بولی۔ "یہاں تو کوئی جھاڑی تک نظر نہیں آ رہی۔ یہ جو چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تمہیں نظر آ رہی ہیں ان کی آگ تو ہمیں بھی چند گز کے فاصلے سے نظر نہیں آ سکتی۔"

"اس کی فکر مت کرو۔ ہم کمبل اور انتہائی ضرورت کی چند چیزوں کے علاوہ جہاز میں موجود ہر چیز جلا دیں گے۔" رضا کہتا ہوا طیارے کے ٹوٹے ہوئے پر کے اوپر چڑھ گیا اور فیول ٹینک کے قریب پہنچ کر ایک بوتل میں تیل نکالنے لگا۔ اس دوران اس کی نظر پائلٹ والے دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ یہ دروازہ بھی ٹوٹ چکا تھا اور سلور کی ایک پتلی سی پٹی کے باعث اپنی جگہ پہ لٹکا رہ گیا تھا۔

رضا کا رخ چونکہ دوسری طرف تھا اس لیے وہ فرشتی کو نہیں دیکھ سکا تھا جو لنگڑاتی ہوئی جہاز کے کارگو کمپارٹمنٹ میں پہنچ گئی تھی اور وہاں سے سامان اٹھا اٹھا کر باہر پھینک رہی تھی تاکہ جو چیز ضرورت کی نہ ہو اسے الاؤ روشن کرنے کے لیے کام میں لایا جا سکے۔ کمال اس وقت پتھروں میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اکھاڑنے میں مصروف تھا۔ یہ جھاڑیاں چھ سات انچ سے زیادہ بڑی نہیں تھیں لیکن اس کے خیال میں ان سے آگ جلانے میں مدد مل سکتی تھی۔ اسی دوران فرشتی نے کارگو کمپارٹمنٹ میں کھونٹی سے لٹکا ہوا کمال کا کینوس بیگ اتار لیا اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس میں کوئی اہم چیز تو نہیں، وہ بیگ کھولنے لگی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے ایک حیرت زدہ سی چیخ نکل گئی۔

فرشتی کی چیخ سن کر کمال تیزی سے اس کی طرف مڑا اور پھر اس کے ہاتھ میں اپنا بیگ دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح اس کی طرف دوڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایکدم سختی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"خبردار! اس بیگ کو چھوڑ دو۔ اسے کھولنے کی کوشش نہ کرنا۔" کمال چیخا۔

لیکن اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ فرشتی اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی بیگ کھول چکی تھی اور اس میں سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالے حیرت زدہ سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

رضا بھی تیزی سے اس طرف گھوم گیا۔ فرشتی کے ہاتھ میں نوٹوں کا بنڈل دیکھ کر اسے صورتِ حال کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ کمپنی کے ملازمین کی تنخواہوں کی رقم دراصل کمال ہی نے چرائی تھی اور اس کا الزام بے گناہ ناصر کے سر تھوپ دیا تھا۔ پچھلی مرتبہ رضا جب بیرام کیمپ آیا تھا تو اس نے اڑتی اڑتی سی یہ خبر سنی تھی کہ کمال نے بیرام نامی قریبی بستی میں ناصر کی بہن پر دست

درازی کی کوشش کی تھی۔ ناصر عام طور پر کیمپ ہی میں رہتا تھا لیکن اتفاق سے اس روز وہ بھی بستی میں پہنچ گیا تھا اور اس نے کمال کی پٹائی کر دی تھی۔ کیمپ میں ناصر سے کمال کا معاندانہ رویّہ غالباً اسی مخاصمت کا نتیجہ تھا اور اب موقع ملتے ہی اس نے ناصر کو چوری کے الزام میں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔

رضا نے ایک جھٹکے سے جہاز کا ٹوٹا ہوا دروازہ اکھاڑ لیا اور چھلانگ لگاتا ہوا کمال پر حملہ آور ہوا۔ کمال نے فوراً ہی فائر کر دیا۔ گولی رضا کے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔ رضا نے اسے دوسرا فائر کرنے کا موقع دیے بغیر دروازہ اس کے سر پر دے مارا۔ اسے دوسرا وار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، کمال منہ سے آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

”تنخواہوں کی رقم کمال نے چرائی تھی۔“ اسفندیار کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔ رضا اس وقت تک کمال کے ہاتھ پیر باندھ چکا تھا۔ ”شاید اسی لیے وہ ہمارے ساتھ آ گیا تھا اور پولیس کو بیان دینے کے بہانے یہ رقم لے کر فرار ہونا چاہتا تھا۔“

رضا نے کمال کا پستول اٹھا لیا جو دور جا گرا تھا۔ وہ پستول فرشتی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اس پر نگاہ رکھنا اب آپ کی ذمہ داری ہے مادام! اگر یہ ہوش میں آنے کے بعد بندشیں کھولنے کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی مار دیں۔“

اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد رضا مدد کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ اس نے کندھے پر نائلون کی رسّی کا ایک لچھا لٹکا رکھا تھا اور جیب میں ایک شکاری چاقو تھا۔ اس کے پاس یہی دو چیزیں تھیں جنہیں ضرورت کے وقت اپنے دفاع میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ وہ کہیں رُکے بغیر شام کا اندھیرا پھیلنے تک چلتا رہا۔ چٹانوں پر چڑھنے اترنے سے اس کے پھیپھڑوں میں درد شروع ہو گیا تھا لیکن وہ مسلسل چلتا رہا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد اس کے لیے سفر جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس وقت ہوا میں بھی خنجر کی سی کاٹ آ گئی تھی۔ وہ یخ بستہ ہوا سے بچنے کے لیے ایک چٹان کی آڑ میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پانی کی بوتل کا ڈھکنا کھول کر چند گھونٹ حلق میں انڈیل لیے۔ تھکن سے اس کی بُری حالت ہو رہی تھی۔ اس نے کوٹ کے کالر گردن تک اٹھا لیے اور نیم دراز ہو گیا پھر نجانے کب وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

❊

دوسرے دن جب اس نے اپنا سفر شروع کیا تو نہ جانے بار بار اسے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس نے کئی بار پیچھے مُڑ کر دیکھا تھا لیکن اسے دور دور تک کسی ذی روح کا نشان تک نظر نہیں آیا تھا۔ وہ اسے اپنا واہمہ سمجھ کر چلتا رہا لیکن دوپہر کے وقت اس نے تعاقب میں آنے والے کی جھلک دیکھ لی۔ اسے یقین تھا کہ یہ کمال کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ان سنگلاخ چٹانوں کے علاوہ ایک انتہائی کمینے اور عیّار دشمن سے بھی اس کا واسطہ تھا اور پستول بھی اگر کمال کے پاس تھا تو وہ اس کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اس کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ کمال کی نگاہوں میں آنے سے بچتا رہے اور جب کمال اس سے آگے نکل جائے تو پشت سے حملہ کر کے اسے گرفت میں لینے کی کوشش کرے۔ بالآخر اسے ایک ایسی جگہ نظر آ گئی جہاں وہ گھات لگا سکتا تھا۔ وہ پہاڑ کے دامن میں بل کھاتا ہوا ایک تنگ سا راستہ تھا جو بارش کے دنوں میں یقیناً پانی کی گزرگاہ رہا ہو گا۔ شمال مشرق کی طرف جانے کے لیے بھی یہی واحد راستہ تھا۔ وہ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد ایک چٹان پر چڑھ گیا جو سائبان کی طرح باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ یہ جگہ زمین سے تقریباً دس فٹ اونچی تھی لیکن چند ہی لمحوں بعد وہ نیچے اُتر آیا۔ چھپنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ وہ کسی اور پناہ گاہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ بالآخر اسے ایک مناسب جگہ نظر آ ہی گئی، وہ ایک تنگ سی دراڑ تھی۔ اس نے دراڑ میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر باہر کو نکلا ہوا ایک پتھر رکاوٹ پیدا کر رہا تھا۔ پتھر کا پچھلا حصّہ اپنی جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا۔ اس نے پتھر کو باہر کھینچنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ جیب سے چاقو نکال کر اس کی نوک سے پتھر اکھاڑنے لگا۔ اس کوشش میں پتھر تو اکھڑ گیا مگر چاقو کا پھل بھی ٹوٹ گیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار گالی نکل گئی۔ یہ اس کے دفاع میں کام آنے والا واحد مؤثر ہتھیار تھا جو اب بے کار ہو چکا تھا۔ وہ دراڑ میں گرے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھر ہٹانے لگا تاکہ اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ بنا سکے۔

پتھروں پر قدموں کی آواز سُن کر وہ چونک گیا۔ وہ یقیناً کمال تھا جو اسی راستے پر آ رہا تھا۔ رضا بڑی پھُرتی سے دراڑ میں گھُس گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد کمال کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا کینوس بیگ کندھے پر لادے دراڑ کے سامنے سے گزر گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی لیکن رضا اپنی جگہ پر چھُپا گہری نظروں سے سامنے سے گزرتے ہوئے کمال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے کمال کے ہاتھ میں پستول وغیرہ نظر نہیں آیا تھا پھر وہ یہ سوچ کر رہ گیا کہ ممکن ہے پستول اس نے کوٹ کے نیچے پتلون کی بیلٹ میں اڑس رکھا ہو۔

رضا اس وقت تک دراڑ میں دبکا رہا جب تک کہ کمال کافی آگے نہیں نکل گیا اور جب وہ اپنی کمین گاہ سے باہر نکلا تو کمال تقریباً تین فرلانگ آگے جا چکا تھا۔ وہ بھی پتھروں کی آڑ لیتا ہوا احتیاط انداز میں اس کے پیچھے چلتا رہا۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ کمال کے بہت قریب پہنچ گیا۔
وہ ایک چھوٹی سی چٹان پر چڑھ گیا تاکہ طویل راستہ اختیار کرنے کے بجائے یہ چھوٹی سی چٹان عبور کر کے کمال کے اس قدر قریب پہنچ جائے کہ اس پر حملہ آور ہو سکے لیکن بدقسمتی سے یہ بھربھری چٹان تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے مٹی اور پتھر سرکنے لگے۔
اس نے اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا۔ مٹی اور پتھر بدستور اس کے اوپر گر رہے تھے جن کے گرنے کی آواز سن کر کمال نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔
رضا نے سنبھلنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگایا تھا۔ وہ کمال کو صورت حال سمجھنے کا موقع دینے سے پہلے ہی ... دبوچ لینا چاہتا تھا۔ وہ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح کمال کی طرف لپکا۔ اسے دیکھ کر کمال نے بھی کندھے پر لٹکا ہوا بیگ نیچے پھینک دیا لیکن اس نے کوٹ یا پتلون کے بیلٹ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ رضا نے کئی فٹ دور ہی سے چھلانگ لگا دی۔ وہ ہوا میں اڑتا ہوا کمال کے اوپر آ رہا۔ دونوں ایک دوسرے میں الجھے ہوئے پتھروں پر گرے۔ کمال نیچے تھا۔ اس نے پیروں کی مدد سے رضا کو پیچھے دھکیل دیا اور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ رضا نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ کمال نے اسے گھونسا رسید کرنا چاہا مگر رضا نے الٹی کلائی پر وار روک کر بایاں گھونسا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ کمال کراہتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ رضا نے اس پر چھلانگ لگا دی مگر کمال بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور رضا منہ کے بل پتھروں پر گرا۔ اگر وہ دونوں ہاتھ آگے نہ بڑھا دیتا تو یقیناً اس کا چہرہ زخمی ہو جاتا۔
اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس دوران کمال اسے دبوچ چکا تھا۔ بھاری بھرکم کمال اس کے سینے پر سوار تھا اور اس نے دونوں ہاتھ رضا کی گردن پر جما دیے تھے۔ انگلیوں کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ رضا کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دفعتاً اسے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے نائلون کی رسی کے لچھے کا خیال آ گیا۔ رسی کا وہ لچھا اس وقت تقریباً دو فٹ دور پڑا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر رسی کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا اور اسے ناکامی نہیں ہوئی۔ رسی کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ گردن پر کمال کے ہاتھوں کی گرفت کچھ اور سخت ہو گئی تھی۔ رضا کو اپنا جسم بے جان ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم کی تمام تر قوت مجتمع کر کے رسی کمال کے گلے میں لپیٹ دی اور اسے پوری قوت سے بل دینے لگا۔ رضا کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ کمال کے حلق سے خرخراہٹ سی خارج ہونے لگی اور رضا کی گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت بھی ڈھیلی ہو گئی۔ بالآخر اس نے رضا کی گردن چھوڑ دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن پر رسی ڈھیلی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔
رضا نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور پھرتی سے اٹھ کر کمال پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ سر پر لگنے والی آخری ٹھوکر کارگر ثابت ہوئی اور کمال نے بے ہوش ہو جانے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔ رضا نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے اور اس کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔
"اسفندیار، فرشتی اور ناصر کہاں ہیں؟ تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟" رضا نے کمال کے ہوش میں آنے پر پوچھا۔
"کچھ بھی نہیں۔" کمال نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "جہاز کے ایک ٹوٹے ہوئے تیز دھار ٹکڑے سے رسی رگڑ رگڑ کر میں نے اپنے آپ کو بندشوں سے آزاد کرایا اور رقم کا تھیلا لے کر بھاگ نکلا۔ میں نے ان تینوں میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ میں کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتا۔"
"ایسی صورت میں تم میرا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟" رضا نے اسے گھورا۔
"میرا خیال تھا کہ تم پر قابو پانے کے بعد تمہیں باندھ کر کہیں ڈال جاؤں گا۔ میں تمہارے ہاتھ پیر اس طرح باندھتا کہ چند گھنٹوں کی کوشش کے بعد تم بندشیں کھولنے میں کامیاب ہو جاتے لیکن اس طرح مجھے تم سے خاصا دور نکل جانے کی مہلت مل جاتی مگر... تمہاری چالاکی سے میرا سارا منصوبہ فیل ہو گیا اور اب میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔"
رضا گہری نظروں سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے خیال میں کمال جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اگر اس نے اسفندیار وغیرہ کو قتل کر دیا ہوتا تو اس وقت پستول بھی اس کے پاس موجود ہوتا جبکہ بے ہوشی کے دوران تلاشی لینے پر اس کے پاس سے پستول برآمد نہیں ہوا تھا۔
"ٹھیک ہے۔" بالآخر رضا گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری بات پر یقین کر لیتا ہوں، فی الحال اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ تمہارے ہاتھ اسی طرح بندھے رہیں گے اور تم میرے ساتھ چلتے رہو گے۔ ہماری منزل ابھی بہت دور ہے۔ ہم یہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے۔"

وہ دونوں پھر چل پڑے۔ کمال آگے تھا اور رضا اس سے چند قدم پیچھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے پر وہ ایک جگہ رُک گئے۔ رضا نے رسّی کا دوسرا سرا اپنی کلائی سے باندھ لیا اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کمال اس سے چند فٹ کے فاصلے پر پتھروں پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد کمال کے تو خراٹے سنائی دینے لگے لیکن رضا کو یہ رات بہر حال جاگ کر گزارنا پڑی تھی۔ کبھی اس کی آنکھ جھپک جاتی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد چونک کر پھر اٹھ جاتا۔

صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی وہ ایک بار پھر چل پڑے۔ رات بھر سردی میں ٹھٹھرنے کے بعد چلنے سے جسم میں کچھ حرارت سی پیدا ہوئی تو انہیں کچھ سکون سا ملا۔

"میں اپنے آپ کو اس کتّے کی طرح محسوس کر رہا ہوں جیسے گلے میں رسّی ڈال کر زبردستی گھسیٹنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔" کمال ایک جگہ رُکتے ہوئے بولا۔ وہ چند لمحے معنی خیز نگاہوں سے رضا کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "سنو رضا! کیوں نہ ہم یہ معاملہ آپس ہی میں طے کر لیں۔ اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں تمہیں آدھی رقم دینے کو تیار ہوں۔ کسی کو ہمارے راز کا پتا نہیں چلے گا۔ اگر میں کبھی پکڑا بھی گیا تو تمہارا نام میری زبان پر نہیں آئے گا۔"

"بکو مت! آگے چلتے رہو۔" رضا نے اسے ڈانٹ دیا۔

"سوچ لو۔" کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہوگی، چند ہزار تومان! میری پیشکش ٹھکرا کر پچھتاؤ گے۔ ڈھائی لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی۔ تم نے کبھی اتنی بڑی رقم کا خواب بھی نہیں دیکھا ہوگا۔"

"میں کہتا ہوں بند کرو یہ بکواس!" رضا چیخا۔ "ساری رقم اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ تقریباً پانچ لاکھ ریال اس میں دس ہزار کم سہی جو تم نے اسفندیار کو لوٹائے تھے۔ اگر میں چاہوں تو تمہارا گلا گھونٹ کر یہ پوری رقم ہضم کر لوں، کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا لیکن ..... میں تمہاری طرح بددیانت نہیں ہوں۔ چلو اب آگے بڑھو۔"

کمال کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ منہ لٹکائے خاموشی سے آگے چل دیا۔

"میرا خیال ہے ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔" دوپہر کے قریب اس نے ایک بار پھر رکتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم صحیح راستے پر ہوتے تو اب تک فیروز آباد کے نواح میں کسی بستی کے قریب پہنچ چکے ہوتے لیکن ان سنگلاخ چٹانوں میں ابھی تک کسی آبادی کے آثار دکھائی نہیں دیے۔"

رضا بھی الجھی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر طرف سنگلاخ چٹانیں تھیں جن کی چوٹیوں کو دُھند

تے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اسے جائے حادثہ سے روانہ ہوئے تیسرا دن تھا اور فیروز آباد وہاں سے زیادہ سے زیادہ ستر بہتر میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اسی لحاظ سے انہیں اب تک فیروز آباد کے نواح میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ پہاڑوں میں ان کے چلنے کی رفتار بہت سست تھی اور وہ اتنا فاصلہ طے نہیں کر پا رہے تھے جتنا کہ انہیں کرنا چاہیے تھا اس نے اسی سمت میں آگے بڑھتے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

تقریباً دو بجے کے لگ بھگ وہ ایک بلند و ہموار جگہ پر پہنچ گئے۔ یہ وسیع پتھریلا میدان تھا جس کے ایک طرف گہری وادی تھی جسے دبیز دھند نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دفعتاً ایک جگہ سے دھند چھٹنے لگی اور تقریباً پانچ سو فٹ نیچے وادی میں درخت دکھائی دینے لگے۔

"اوہ!" کمال کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "وہاں جنگل میں یقیناً پانی بھی موجود ہوگا۔ شاید کوئی ایسا درخت بھی مل جائے جس کے پھل سے ہم اپنی بھوک مٹا سکیں۔ بھوک اور پیاس سے اب مجھ سے ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔"

بھوک اور پیاس سے رضا کی حالت بھی ابتر ہو رہی تھی۔ یہ تو ان کی قوتِ ارادی تھی جس کے سہارے وہ اب تک چلے جا رہے تھے۔ کمال کا مشورہ قابلِ قبول تھا۔ وہ دونوں انتہائی دشوار گزار راستے پر نیچے اترنے لگے۔ پھر بھرے پتھریلے راستے پر اترتے ہوئے کئی مرتبہ کمال پھسلا تھا اور گرتے گرتے بچا تھا۔ اگر اس کی پشت پر ہاتھوں سے بندھی ہوئی رسی کا دوسرا سرا رضا کی کلائی سے نہ بندھا ہوتا تو وہ اب تک لڑھک کر اپنی ایک آدھ ہڈی تڑوا چکا ہوتا۔

دفعتاً وہ چلتے چلتے رک گئے۔ گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر انہوں نے اوپر دیکھا۔ مٹی اور پتھروں کا ایک طوفان تھا جو خوفناک آواز کے ساتھ نیچے آ رہا تھا۔ راستے کی دشواری کی پروا کیے بغیر وہ بھاگ اٹھے۔ کمال رضا سے کئی قدم آگے تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں بندھی ہوئی رسی بار بار ٹائٹ ہو رہی تھی جس سے رضا کی کلائی کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس نے رسی کو اپنی کلائی سے تقریباً ایک فٹ آگے سے اس طرح پکڑ لیا کہ اب اگر تناؤ پیدا ہو تو اس کی کلائی کو جھٹکا نہ لگ سکے۔

دفعتاً اوپر سے آنے والا ایک پتھر رضا کے کندھے پر لگا۔ وہ اس وقت ایک تنگ سے راستے کے کنارے پر تھا۔ کندھے پر پتھر لگتے ہی وہ لڑکھڑایا اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے ہوا میں اڑ رہا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے اسے ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ فضا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا اور کلائی پر بندھی ہوئی رسی تار کی طرح تنی ہوئی تھی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کئی فٹ اوپر رسی ایک پتھر میں پھنسی ہوئی تھی اور کمال کی ہلکی ہلکی غراہٹ کی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کمال کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور وہ دو پتھروں کے بیچ میں پھنسا اپنے آپ کو روکے ہوئے تھا رقم سے بھرا ہوا تھیلا اس وقت تک رضا کے بائیں کندھے پر لٹکا ہوا تھا لیکن اس نے بائیں ہاتھ سے رسی کو پکڑنے کے لیے جیسے ہی ہاتھ کو حرکت دی، تھیلا پھسل کر سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں جا گرا۔ رضا نے نیچے دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا جسم پسینے میں تر ہونے لگا۔ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں خیال ابھرا تھا کہ اگر رسی ٹوٹ گئی یا کمال اپنے آپ کو زیادہ دیر تک روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو وہ دونوں قلابازیاں کھاتے ہوئے گہرے کھڈ میں جا گریں گے۔ اتنی بلندی سے پتھروں پر گرنے کے بعد ظاہر ہے ان کی لاشوں کی شناخت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ کچھ دیر تک اسی طرح فضا میں معلق رہا پھر چٹان میں اگی ہوئی جھاڑیوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ بیری سے ملتی جلتی جھاڑیوں کی شاخیں موٹی تھیں لیکن کوئی بھی شاخ اس کے ہاتھ کی رسائی میں نہیں تھی۔ وہ اپنے جسم کو آہستہ آہستہ اس طرح حرکت دینے لگا جیسے جھولا جھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس طرح رسی میں مزید تناؤ پیدا ہو رہا تھا اور رسی اس کی کلائی میں گڑی جا رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے اس کی کلائی کٹ کر الگ ہو جائے گی۔ بالآخر تیسری کوشش میں وہ بائیں ہاتھ سے ایک جھاڑی کی شاخ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح سہارا لے سکتا جھاڑی جڑ سے اکھڑ گئی اور وہ پھر فضا میں معلق ہو گیا۔

وہ ایک بار پھر ہوا میں جھولنے لگا۔ اس مرتبہ اس کا جھکاؤ اس طرف تھا جہاں نسبتاً موٹی شاخوں والی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد وہ پھر ایک جھاڑی کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پیر ایک چھوٹے سے کھڈ میں پھنسا دیے تھے۔ وہ جھاڑیوں اور ابھرے ہوئے پتھروں کا سہارا لیتا، دراڑوں میں پیر پھنساتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ بالآخر وہ اس پتھر تک پہنچ گیا جس میں رسی پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پتھر کے کنارے پر جما دیے اور اپنے جسم کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔

پتھر پر گر کر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کے جسم کے مسام ابھی تک پسینہ اگل رہے تھے۔ اس نے کمال کی طرف دیکھا جو دو پتھروں کے بیچ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ کرب کی

تصویر بنا ہوا تھا۔ رضا کے بوجھ اور رسی کے تناؤ سے کوئی عجب نہیں تھا کہ اس کے دونوں بازو کندھوں سے اکھڑ گئے ہوں۔ رضا اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔

"رقم والا تھیلا کھسک کر کھڈ میں جا گرا ہے۔ اب تمہیں باندھے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں اور مجھے امید ہے کہ اب تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے۔"

"لعنت بھیجو رقم پر!" کمال کراہتے ہوئے بولا۔ "دو مرتبہ مرتے مرتے بچا ہوں۔"

رضا نے اوپر دیکھا۔ پتھروں کا آبشار اگرچہ رک گیا تھا، لیکن اِکّا دُکّا چھوٹے پتھر اب بھی گر رہے تھے۔ وہ دونوں چند لمحے اوپر دیکھتے رہے پھر تنگ سے راستے پر نیچے اترنے لگے۔

"تم نے جس طرح میری جان بچائی ہے میں اس کے لیے تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کمال!" رضا نے چلتے چلتے کہا۔

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔" کمال نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں کی زندگیاں ایک دوسرے سے مشروط تھیں۔ اگر تمہاری جان جاتی تو میں بھی زندہ نہ بچتا۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" رضا نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

اس وقت تقریباً ساڑھے تین بج رہے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر رضا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اسے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ اوپر سے گرنے والا رقم سے بھرا ہوا تھیلا گہرے کھڈ میں گرنے کے بجائے تقریباً سو فٹ کی بلندی پر چٹان میں اگے ہوئے ایک درخت کی شاخ میں پھنس گیا تھا۔ کمال بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا پھر وہ رضا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کاش یہ تھیلا نیچے گر گیا ہوتا تو ہم اسے تلاش کر لیتے۔"

"اس کھڈ تک پہنچنا بھی خودکشی کے مترادف ہوتا۔ ویسے بھی تم اس پر لعنت بھیج چکے ہو اس لیے اس کے بارے میں سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس وقت ہم کہاں پر ہیں؟" رضا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا اندازہ درست تھا کہ ہم راستہ بھٹک چکے ہیں۔ فیروز آباد کے نواح میں میلوں دور تک اس قسم کے درخت نہیں پائے جاتے۔ ہم بہت زیادہ شمال کی طرف آ گئے ہیں۔ اور یہ جنگل!" وہ درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس جنگل سے کبھی کوئی درخت نہیں کاٹا گیا۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس علاقے میں کبھی کسی کی آمد و رفت نہیں رہی؟" رضا نے کہا۔

"ہاں۔ میرا یہی اندازہ ہے۔" کمال بولا۔

رضا متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا پھر یکایک اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ وہ ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر رہا تھا جہاں بلندی پر درختوں کے جھنڈ میں لکڑی کا ایک کاٹج بنا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کمال نے بھی وہ کاٹج دیکھ لیا۔ ان کے دل میں امید کی کرن روشن ہو گئی اور وہ دیوانہ وار کاٹج کی طرف دوڑ پڑے۔ اسی لمحے بارش شروع ہو گئی۔ پہلے موٹی موٹی بوندیں گریں جنہوں نے یکایک موسلا دھار بارش کی صورت اختیار کر لی۔

"ہم پیاس بجھانے کے لیے پانی کی تلاش میں اس وادی میں اترے تھے۔" کمال دوڑتے ہوئے بولا۔ "لیکن لگتا ہے یہاں ہمارے ڈوبنے کا سامان ہو رہا ہے۔"

جب وہ کاٹج کے قریب پہنچے تو ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ یہاں کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ دروازہ مقفل تھا۔ کمال نے زنگ آلود تالے کو جھٹکے سے کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ پھر اس نے پیچھے ہٹ کر کندھے سے زوردار ٹکر ماری، دروازہ کھل گیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے مگر مایوسی میں اضافے کے سوا انہیں کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ دو کمروں پر مشتمل یہ کاٹج خالی تھا۔ البتہ ایک کمرے میں لوہے کے اسپرنگوں والی ایک چارپائی نظر آ رہی تھی۔ فرش پر گرد کی تقریباً ایک انچ موٹی تہہ جمی ہوئی تھی جس سے اندازہ
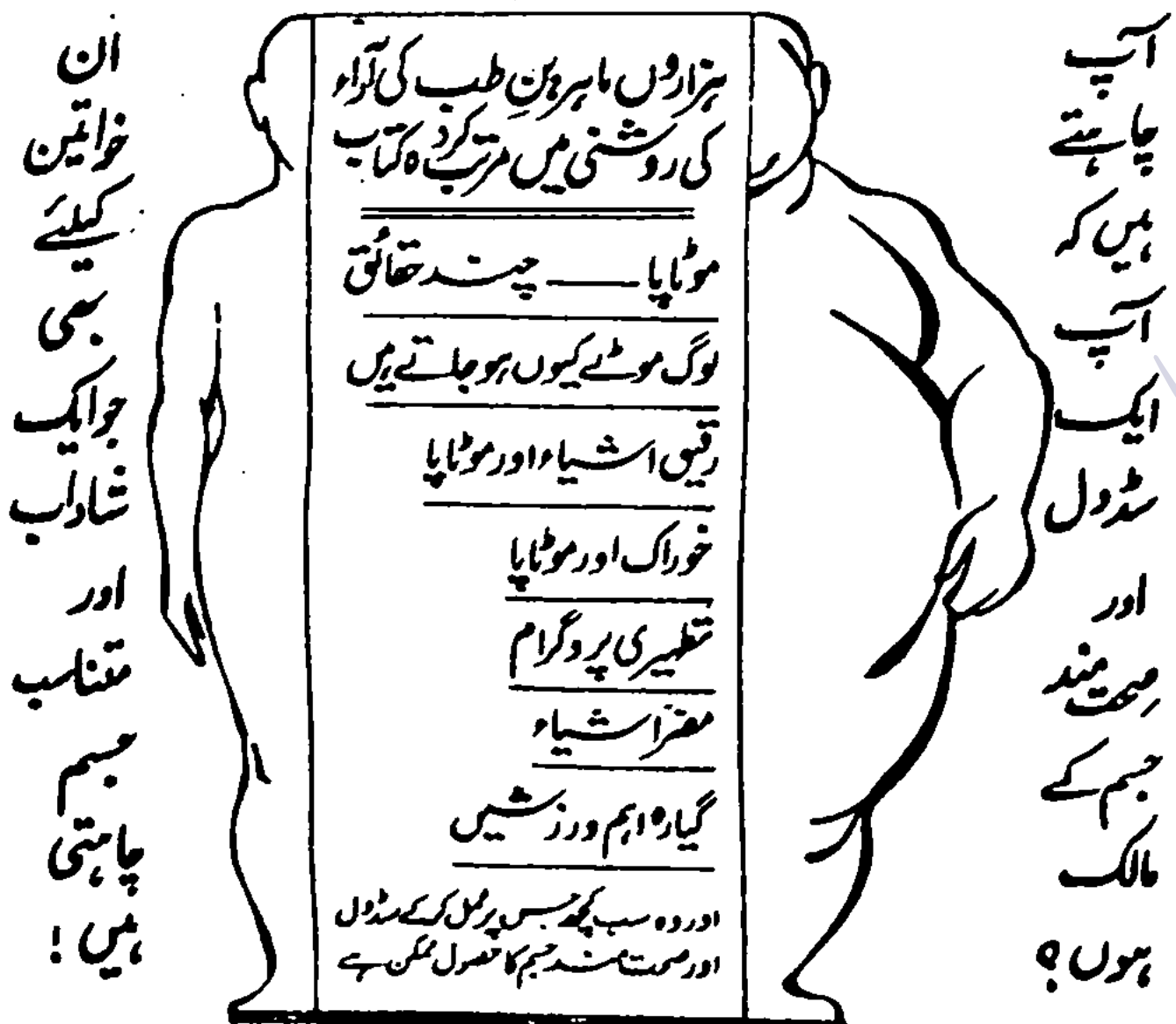
لگایا جاسکتا تھا کہ طویل عرصے سے یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔

رضا چارپائی پر بیٹھ گیا اور مایوسانہ نگاہوں سے کمرے کے گرد آلود فرش اور دیواروں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"یہ کاٹیج خالی کیوں ہے؟"

"یہ غالباً فارسٹ رینجرز کی چوکی ہوگی۔" کمال بولا۔ "جنگلوں میں تمہیں اس قسم کے بہت سے ہٹ ملیں گے جو اکثر خالی رہتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ ہٹ پکنک منانے والوں سے آباد ہو جاتے ہیں لیکن پکنک منانے والے بھی اتنی دور کبھی نہیں آئیں گے۔ میں اُن ہٹوں کی بات کر رہا ہوں جو آبادی سے قریب تر ہو سکتے ہیں۔"

رضا کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ بارش بدستور ہو رہی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد بارش جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح یکایک بند بھی ہو گئی۔ بارش کے ساتھ ہی دُھند بھی غائب ہو گئی تھی اور مطلع ایک دم صاف ہو گیا تھا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ آگ جلالی جائے لیکن مشکل ہی نظر آرہا ہے۔ سوکھی لکڑیاں کہیں نہیں ملیں گی۔" کمال نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ سوکھی لکڑی کہاں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔" رضا نے ہنستے ہوئے جیب سے لائٹر نکال کر جلا لیا۔ لائٹر کے شعلے کی روشنی میں اس کی آنکھوں کی چمک بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔

کمال کو بھی اس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ کاٹیج کی دیواروں کے تختے اُکھیڑنے لگا جو پہلے ہی بوسیدہ ہو رہے تھے اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ تقریباً سو گز دُور کھڑے جلتے ہوئے کاٹیج کو دیکھ رہے تھے جس سے اٹھنے والا گھنے دھوئیں کا بادل آسمان کی بلندیوں تک پہنچ رہا تھا۔

لکڑی کا کاٹیج جل کر کوئلے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسی وقت فضا میں ایک زناٹے کی آواز سُنائی دی۔ ان دونوں نے اوپر دیکھا۔ وہ محکمہ جنگلات کا ہیلی کاپٹر تھا جو آہستہ آہستہ نیچے اُتر رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑے اور جیسے ہی ہیلی کاپٹر کا پائلٹ نیچے اترا رضا چیخ چیخ کر اسے بتانے لگا۔

"ہمارے دوسرے ساتھی پہاڑوں میں ہیں..... چار دن پہلے ہمارا جہاز ان پہاڑوں میں گر کر تباہ ہو گیا تھا۔"

ہیلی کاپٹر میں پائلٹ کے علاوہ دو آدمی اور تھے۔ انہوں نے رضا اور کمال کو ہیلی کاپٹر پر سوار ہونے میں مدد دی اور اس کے فوراً ہی بعد ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو گیا۔ ان دونوں کو شیراز کے اسپتال میں چھوڑ کر ہیلی کاپٹر ان پہاڑوں کی طرف پرواز کر گیا جہاں سیسنا گر کر تباہ ہوا تھا۔ رضا نے نقشے کی مدد سے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو جائے حادثہ کا حدود اربعہ سمجھا دیا تھا۔

اسی رات رضا پر یہ انکشاف ہوا کہ کمال اسپتال سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ اب اپنی حماقت پر پچھتا رہا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ یا کسی اور کو یہ بتانا بھول گیا تھا کہ کمال مجرم ہے جو شیراز آئل کمپنی کے ملازمین کی تنخواہوں کی پانچ لاکھ ریال کی رقم لے کر بھاگا تھا اور ان پر یہ ساری مصیبتیں اسی کی وجہ سے نازل ہوئی تھیں۔

رات ہی کو اسفندیار، فرشتی اور ناصر کو بھی اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ان تینوں کی حالت کچھ زیادہ ہی ابتر ہو رہی تھی لیکن بہرحال انہیں بچا لیا گیا۔ دوسرے دن جب پولیس کو کمال کے بارے میں بتایا گیا تو فوراً ہی اس کی تلاش شروع ہو گئی لیکن ایک ہفتے بعد بھی اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تو پولیس نے اس کی تلاش ترک کر دی لیکن رضا جانتا تھا کہ کمال کو کہاں تلاش کیا جا سکتا تھا۔

ایک ہفتے بعد پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا رضا جب اس پہاڑ کے دامن میں پہنچا جہاں وہ گر کر تقریباً آدھے گھنٹے تک فضا میں معلق رہا تھا۔ تو اسے آگے بڑھنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی لیکن وہ جیسے تیسے اس کھڈ تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا مگر مزید آگے بڑھنے کے بجائے اسے وہیں رُک جانا پڑا۔ کھڈ میں ایک جگہ لاتعداد گدھ کسی چیز پر جھپٹ رہے تھے۔ کبھی وہ پر پھیلا کر آپس میں لڑنے لگتے۔

رضا کو صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ کمال کے بارے میں اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا تھا۔ پتھروں پر اس کی لاش پڑی تھی جس پر گدھ جھپٹ رہے تھے۔ وہ چند لمحے گدھوں کے غول کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نظریں اوپر اُٹھ گئیں جہاں تقریباً سو فٹ اوپر عمودی چٹان میں اُگے ہوئے درخت کی شاخوں میں رقم سے بھرا ہوا تھیلا لٹک رہا تھا۔

اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کمال نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف سے اُترنے کی کوشش کرتے ہوئے درخت کی شاخوں میں پھنسا ہوا وہ تھیلا اتارنے کی کوشش کی ہو گی لیکن سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں گر کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور یوں آخر مُردار خور گدھوں کی خوراک بن گیا۔

رضا کچھ دیر وہاں کھڑا کبھی اوپر درخت پر پھنسے ہوئے تھیلے کو اور کبھی گدھوں کے جھرمٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر واپس مُڑ گیا۔ ظاہر ہے اب وہ کمال کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

THE PSYCHO OF PLANE CRASH
Grant Freeling